بشیر احمد ڈار

# مصرِ قدیم کا فلسفۂ اخلاق

آثارِ قدیمہ کی کھدائی سے جو حالات معلوم ہوئے ہیں ان کی رُو سے مصری تاریخ کو مختلف ادوار میں تقسیم کیا گیا ہے۔ پہلا دور کم از کم ۷۰۰۰ قبل مسیح سے شروع ہوتا ہے اور جس کو اتحادِ اوّل کا نام دیا جاتا ہے۔ اس دور میں تمام مصر ایک منظم اور متحد ریاست کی شکل میں ایک طاقتور بادشاہ کی راہنمائی میں ظاہر ہوتا ہے۔ اس کے بعد دوسرا دور ۳۵۰۰ قبل مسیح سے شروع ہو کر ۲۵۰۰ قبل مسیح تک پھیلا ہوا ہے جس کو اتحادِ ثانی کا نام دیا جاتا ہے۔ محققین کا خیال ہے کہ اس دور میں جس چیز کو تمدن کہا جاتا ہے وہ مکمل طور پر موجود تھا۔ تمدن سے مراد دو چیزیں ہیں۔ اوّل معاشرتی نظام کی بنیاد قانون اور امن پر ہو اور دوسرا ایک شعوری مقصد جس کے حصول کے لئے باشندوں کی کم از کم ایک اقلیت کوشاں ہوں۔ اس تعریف کو اگر تسلیم کیا جائے تو یہ ماننا پڑتا ہے کہ مصر ان دونوں دوروں میں صحیح معنوں میں ایک متمدن ملک تھا لیکن ابھی تک جو کچھ ہمیں تحریری یادداشتیں حاصل ہوئی ہیں وہ اتحادِ ثانی کے دور سے متعلق ہیں۔ اگرچہ ان کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ مصر کے مفکرین نے اس دور سے کافی پہلے اخلاقی مسائل پر غور و خوض کیا تھا۔

سب سے پہلی چیز جو اتحادِ ثانی کے دور کی یادگار کے طور پر سامنے آتی ہے ایک حجری کتبہ ہے جو خوش قسمتی سے محفوظ رہ گیا۔ اس کا مضمون مصری علماء نے ۳۵۰۰ قبل مسیح کے قریب تیار کیا جو ایک قدیم کاغذ پر منتقل کر دیا گیا۔ لیکن مرورِ زمانہ سے یہ تحریر خراب ہوتی چلی گئی۔ بعد میں ایک حبشی فرعون شباکا نے جو آٹھویں صدی قبل مسیح میں تھا اس کو پتھر پر کھدوا دیا تاکہ "یہ قدیم بزرگوں" کی یادگار ضائع نہ ہونے پائے۔ اس کا قابلِ ذکر پہلو یہ ہے کہ انسان کی تاریخ میں یہ پہلی چیز ہے جس میں اس نے اخلاقی مسائل کو معروضی شکل میں پیش کرنے کی کوشش کی۔ اس میں درست و نادرست، خوب اور ناخوب کی بحث اس چیز کی غمازی کرتی ہے کہ آج سے ساڑھے پانچ ہزار سال پہلے کا انسان بھی اخلاقی حیثیت سے انہی مسائل سے دوچار تھا جو آج اسے پیش آ رہے ہیں۔ مغربی مصنفین کا یہ عام دستور رہا ہے کہ وہ انسانی فکر کا آغاز یونان کے حکیم تھیلز سے شروع کرتے ہیں لیکن یہ حجری کتبہ اس سے تقریباً دو ہزار سال پہلے عالمِ وجود میں آیا اور اس کی یہ قدامت ہی اس کی اہمیت واضح کرنے کے لئے کافی ہے۔

اس کتبہ میں خدا کو جن الفاظ میں یاد کیا گیا ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ مصریوں کے ہاں خدا کے متعلق کافی ترقی یافتہ تصور موجود تھا۔ کہا جاتا ہے کہ خدائے مطلق "دیوتاؤں کا قلب اور زبان ہے"۔ تمام مشرقی ادیان اور ادب میں قلب یا دل

کا لفظ عقل کے لئے استعمال ہوتا ہے اور زبان گویا وہ عضو ہے جس سے ذہنی تصورات خارجی دنیا میں معروضی لباس پہنتے ہیں۔ خدائے مطلق کو قلب اور زبان دونوں کا منبع قرار دینے کا گویا یہ مفہوم ہوا کہ یہ کائنات اس خدائے مطلق کے ذہنی تصورات کی ایک خارجی اور مادی شکل ہے۔ یہ تمام کتبہ اسی بنیادی مسئلے کے متعلق آلہا خیال ہے جس کو بعد میں یہودی پیغمبروں اور یونانی فلاسفہ نے اپنے اپنے طریقوں سے حل کرنے کی کوشش کی یعنی مسئلہ تخلیق کائنات۔ یونان میں جب اس مسئلہ پر بحث شروع ہوئی تو فلاسفہ نے اس کے مختلف جوابات دیئے۔ تھیلز کا خیال تھا کہ یہ کائنات پانی سے ظاہر ہوئی۔ انکسامینڈر کا خیال تھا کہ اس کا آغاز ایک قسم کی دھند سے ہوا۔ ان کے برعکس مصری مفکرین کے نزدیک جو ان یونانی فلاسفہ سے تیس صدیاں پہلے گزرے تھے اس کائنات کا آغاز عقل یا تصور سے ہوا۔ یہ یونانی فلاسفہ سے کہیں زیادہ بہتر اور معقول جواب ہے۔ اس کتبے میں مذکور ہے: "واقعہ یوں ہوا کہ قلب اور زبان نے ہر عضو پر قابو پالیا اور یہ تعلیم دی کہ خدا تمام دیوتاؤں، تمام انسانوں، تمام مویشی، تمام کیڑے مکوڑوں غرض تمام جانداروں کے سینوں میں (قلب کی شکل میں) اور (زبان کی شکل میں) ہر منہ میں موجود ہے۔ وہی سوچتا اور وہی حکم دیتا ہے ہر چیز کو جو وہ چاہتا ہے۔۔۔۔۔ اسی نے ہر شے کا نام اپنی زبان سے ادا کیا، آنکھوں کی بینائی، کانوں کی شنوائی، ناک میں سانس لینے کی قوت پیدا کی تاکہ یہ تمام چیزیں قلب تک پہنچ سکیں۔ یہ قلب ہی ہے جس سے تمام نتائج پیدا ہوتے ہیں اور یہ زبان ہے جو قلب کے تمام تصورات کو ظاہر کرتی ہے۔۔۔۔ ہر لفظ جو خدا کے منہ سے نکلا در حقیقت قلب کے تصورات کا نتیجہ تھا اور زبان سے ادا ہوا۔ اس طرح مقامات (سرکاری مناصب) قائم ہوئے اور (حکومت کے مختلف) فرائض کا تعین ہوا جس سے نمو اور خوراک کا انتظام مکمل ہوا۔"

اس کے بعد درج ہے: "ایک وہ شخص ہے جس سے پسندیدہ افعال صادر ہوتے ہیں، ایک شخص وہ ہے جس سے ناپسندیدہ افعال صادر ہوتے ہیں۔ امن و سکون والے شخص کو زندگی اور مجرم کو موت دی جاتی ہے۔" "اس دنیا میں ہر کام اور ہر پیشہ چلتا ہے۔ بازوؤں اور ٹانگوں اور جسم کے دیگر اعضاء کی حرکت سبھی اس حکم کے مطابق ظاہر ہوتا ہے جو قلب سوچتا ہے، جو زبان سے ادا ہوتا ہے اور جس سے ہر شے کی قدر و قیمت کا تعین ہوتا ہے۔"

"ٹا (خدا کا نام) کے متعلق مشہور ہے کہ اس نے تمام دیوتاؤں کو بنایا۔ ہر چیز اس سے صادر ہوئی خواہ وہ انسانوں کی خوراک ہو یا دیوتاؤں کی غرض ہر اچھی چیز کا ظہور اس سے ہوا۔ اس طرح معلوم ہوا کہ اس کی طاقت و جبروت تمام دیوتاؤں سے بڑھ چڑھ کر ہے اور جب ہر چیز کی تخلیق ہو چکی تو ٹا نے ایک نظر ڈالی اور اپنی تخلیق سے مطمئن ہوا۔"

"وہی تمام دیوتاؤں کا خالق ہے۔۔۔ اور ان کے متفرق صفات سب اس میں جمع ہیں۔"

اس مختصر سے کتبہ میں فلسفہ، دین اور اخلاق کے سبھی مسائل درج ہیں اور اس خوبی سے ان پر روشنی

ڈالنے کی کوشش کی گئی ہے کہ پڑھنے والے کے ذہن میں یہ خیال بھولے سے نہیں گزرتا کہ یہ بیان آج سے ساڑھے چار ہزار سال پہلے معرضِ تحریر میں آیا تھا جبکہ عام خیال کے مطابق انسان ابھی منزلِ طفولیت میں تھے۔ سب سے اہم تصوّر جو اس کتبہ کے مصنف نے پیش کیا ہے وہ میکانیت کے مقابلے پر ارادہ اور مادہ کے مقابلے پر ذہن و تصوّر کی اہمیت ہے۔ افلاطون نے سقراط کے حالات پیش کرتے ہوئے اپالوجی میں اس کی ذہنی کش مکش کا ذکر کیا ہے کہ کس طرح وہ طبعی فلاسفہ کی مادیت سے بیزار ہو کر کسی ایک قادرِ مطلق کی تلاش میں سرگرداں تھا جو کائنات کی گتھی سلجھانے میں اس کی راہنمائی کر سکے۔ اسی تگ و دو میں اسے معلوم ہوا کہ انکساغورس نے اس مقصد کے لئے نفس یا ذہن کا تصوّر پیش کیا ہے۔ لیکن سقراط کو انکساغورس کے تصوّرات سے کوئی اطمینان نہ ہو سکا کیونکہ اس کا تصوّرِ نفس محض تصور تھا۔ اس نے کائنات کی گتھی سلجھانے میں اس سے کوئی مدد نہ لی تھی۔ اس طرح سقراط اس نتیجہ پر پہنچا تھا کہ تخلیق کائنات کی تشریح مادے اور میکانیت سے ممکن نہیں بلکہ اس کے لئے نفس و ذہن کا وجود تسلیم کرنا ناگزیر ہے۔ یہی وہ حقیقت تھی جو سقراط اور یونانیوں سے صدیوں پہلے مصری حکماء پیش کر چکے تھے۔ ان کے نزدیک ہر چیز کی تخلیق اس تصوّر سے ہوئی جس کو نفس نے سوچا اور زبان سے ادا ہوا۔ نفس کی تخلیقی قوت کا باعث وہ کلمہ تھا جس نے تصور کو متشکل کیا اور وجود بخشا۔ خدا ہی وہ نفس مطلق ہے جو سوچتا ہے اور وہ زبان ہے جو کلام کرتی ہے۔ قرآن میں تخلیقی عمل کے متعلق ارشاد ہے:

| | |
|---|---|
| واذا قضیٰ امراً فانما یقول لہٗ کن فیکون۔ (۲ : ۱۱۷) | جب خدا کوئی کام کرنا چاہتا ہے تو اس کو کہہ دیتا ہے کہ ہو جا تو وہ ہو جاتا ہے۔ |

یہی لفظ "کُن" ہی گویا تخلیق کائنات کا آغاز اور کنجی ہے اور یہی کلمۃ اللہ ہے جس کے متعلق یوحنا کی انجیل کے ابتدائی فقرات مشہور ہیں:

"ابتدا میں کلام تھا اور کلام خدا کے ساتھ تھا اور کلام خدا تھا۔ یہی ابتدا میں خدا کے ساتھ تھا۔ سب چیزیں اس کے وسیلے سے پیدا ہوئیں۔ اور جو کچھ پیدا ہوا ہے اس میں سے کوئی چیز بھی اس کے بغیر پیدا نہیں ہوئی۔" قرآن میں حضرت عیسیٰ کے متعلق "کلمۃ من اللہ" کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں اور اس کے علاوہ بے شمار جگہ مختلف معنوں میں یہ لفظ آیا ہے۔ یونانی فکر میں ہیکلیٹس کے ہاں لفظ کلمہ یا کلام پہلی بار ملتا ہے جس سے مراد ایک تخلیقی اصول، ایک جرثومۂ خیال یا خدا کی تکوینی صفت کا ایک ذریعہ ہے۔

اس کے بعد افلاطون کے ہاں اس کا ذکر ملتا ہے جس سے وہ خدا کی تخلیقی قوت کا وہ پہلو نمایاں کرنا چاہتا ہے جس سے کثرت وجود میں آئی۔ لیکن یہ تصور معلوم ہوتا ہے خود یہودیوں کے ہاں بھی موجود تھا اور وہاں کلمہ یا کلام کی بجائے "حکمت" کی اصطلاح پائی جاتی ہے۔ یہودی فلسفی فیلو نے ان دونوں تصورات میں ہم آہنگی پیدا کرنے کی کوشش کی اور

اس کے بعد عیسائی اور مسلمان مفکرین نے مختلف شکلوں میں اس مسئلے پر بحث کی ہے۔ لیکن مصر کے اس قدیم حجری کتبے کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ایسا بلند تصور یہودی اور یونانی فکر سے صدیوں پہلے انسانی ذہن میں پیدا ہو کر تحریری شکل اختیار کر چکا تھا۔ اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ مصر کا سیاسی اور دینی موقف کافی ترقی یافتہ اور بلند تھا۔ اگر اس کا مقابلہ ہندوستانی دینی فکر سے کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ ہندو مفکرین مدت مدید تک کثرت پرستی میں مبتلا رہے اور ان کے دیوتا محض قوائے فطری کے مظاہر کے طور پر صدیوں تک پوجے جاتے رہے جبکہ آج سے پانچ ہزار سال پہلے ہی مصری مفکرین بہت جلد اس دور سے گذر کر خدائے واحد کے تصور تک جا پہنچے اور فطرت و کائنات کے مظاہر کے پیچھے ان کی نظر کائنات کے خالق تک رسائی حاصل کر چکی تھی۔ ان کی نگاہ نے یہ تسلیم کیا کہ یہ نظام کائنات حکمت و دانائی سے چل رہا ہے اور اس بنا پر وہ اس نتیجے تک پہنچے کہ اس کی تکوین محض جادو سے نہیں ہوئی، محض اتفاق و کھیل سے یہ چیز پیدا نہیں ہوئی بلکہ اس میں ایک خاص مقصد کارفرما ہے جو اس وقت بھی موجود تھا جب اس کا آغاز ہوا اور آج بھی جب وہ ارتقاء کی منزلیں طے کرتے ہوئے اس مقام پر پہنچ چکی ہے تو اس میں حکمت و دانائی ہر طرف نمایاں ہے۔ وہ خدائے عزیز ہر جاندار کے قلب و سینے اور ہر کلام کرنے والے کی زبان میں موجود ہے۔

اخلاقی مسائل جن کی طرف اس حجری کتبہ میں اشارات موجود ہیں ظاہر کرتے ہیں کہ مصری حکماء و مفکرین کافی مدت سے اس سلسلہ میں غور و خوض کرتے رہے تھے۔ نیکی اور بدی، مستحسن اور غیر مستحسن اعمال کی تمیز کا واضح تصور اس چیز کی دلالت کرتا ہے کہ انفرادی اور اجتماعی طور پر لوگوں میں قلبی و ذہنی کش مکش کا احساس پیدا ہو چکا تھا۔ ان کے سامنے دو نو راستے واضح طور پر موجود تھے اور شعوری طور پر ہر ایک کو اختیار کرنے اور دوسرے سے پرہیز کرنے کا رجحان پیدا ہو چکا تھا اور یہ احساس منحصر تھا اس حقیقت پر کہ انسان اس وقت ابتدائی قبیلوی زندگی سے ترقی کر کے منظم اور متحد ریاست میں اپنا انفرادی مقام حاصل کر چکا تھا۔ اس کے علاوہ اس کتبے کے مصنف یا مصنفین نے کوشش کی ہے کہ اخلاقی اعمال کو دینی سرچشمہ سے ملا دیا جائے۔ چنانچہ مذکور ہے کہ "زندگی اس شخص کو دی جاتی ہے جو امن و آشتی کا علمبردار ہے اور مجرم کے لئے موت ہے"۔ یہاں نیک اور بد کے الفاظ کی جگہ امن و سکون کے علمبردار اور جرم کا ارتکاب کرنے والے کی اصطلاحات استعمال کی گئی ہیں جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ اخلاقی صفات کو معاشرتی پسندیدگی اور غیر پسندیدگی کا لباس دیا گیا ہے۔ امن و سکون کا علمبردار وہ ہے جس سے ایسے افعال سرزد ہوں جو لوگوں کی نگاہ میں پسندیدہ ہوں اور جن سے وہ محبت کرتے ہوں۔ اس کے برعکس جرم وہ فعل ہے جو غیر پسندیدہ ہو اور جس سے لوگ نفرت کرتے ہوں۔ اس سے صاف طور پر یہ چیز واضح ہو جاتی ہے کہ اخلاقی مسائل کو انہوں نے معاشرتی ماحول میں سمجھا اور پیش کیا۔ دوسرے ان کے ہاں خدا کا بہت واضح تصور موجود تھا۔ اس کی ذات محض موہوم نہ تھی بلکہ تمام اعلیٰ صفات کی حامل اور مشخص ذات تھی جو تکوین و تخلیق

کائنات کے بعد آسمانوں کی بلندیوں پر غافل و بے پروا تھی۔ وہ خدا انسانوں کے اعمال و افعال سے بلا واسطہ دلچسپی لیتا ہے، ان کی نیکی اس کی رضا اور خوشنودی کی موجب تھی اور ان کے بد اعمال و افعال اس کی ناراضگی کا باعث ہوتے تھے، وہ ان کو ان کے اعمال کے مطابق سزا اور جزا دیتا تھا۔ وہ لوگوں کا راہنما اور ہادی بھی تھا اور ان کے نیک و بد کا فیصلہ کرنے والا، وہ نیکوں کا دوست اور بدوں کا دشمن تھا، وہ صاحبِ امر بھی ہے اور صاحبِ حکمت بھی۔

اس کے بعد اہرامی کتبات ہیں جو مصر کے امراء نے اپنے مقبروں کی دیواروں پر کندہ کروائے۔ یہ کتبات محققین کے خیال میں چھبیسویں صدی قبل مسیح سے کچھ پہلے اور کچھ بعد کے دور سے متعلق ہیں۔ ۲۶۲۵ قبل مسیح سے لیکر ۲۴۷۵ قبل مسیح کے درمیانی زمانے میں یہ کتبات وجود میں آئے اور ان کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اخلاقی احساس کی بنیاد عائلی زندگی کے مطالبات و تقاضوں پر تھی۔ معاشرتی نفسیات کے ماہرین کا خیال ہے کہ اخلاقی اقدار کی ابتدا درحقیقت ایک خاندان میں مختلف افراد کے باہمی رشتہ اور تعلق اور اس سے پیدا شدہ حقوق و فرائض سے ہوئی ہے۔ مثلاً مشہور ماہر نفسیات میکڈوگل کا کہنا ہے کہ بہت سی اخلاقی خوبیاں مثلاً سخاوت، محبت، رحم، احسان شکر، صحیح احسان اور ہر قسم کا بے غرضانہ عمل سبھی اسی پدری و مادری جذبے کی پیداوار ہیں جو عائلی زندگی کا مرکزی نقطہ ہے۔ اخلاق کے ارتقاء کے لئے خاندان اور اس کے بعد معاشرے کا وجود ناگزیر ہے کیونکہ اس کے بغیر اخلاقی اقدار اور حسنات کا پیدا ہونا ممکن نہیں۔ ماہرین نفسیات کا یہ قیاس مصر کے ان اہرامی کتبات کے مطالعہ سے تاریخی طور پر صحیح ثابت ہوتا ہے۔ مختلف مقابر میں جو تحریریں دستیاب ہوتی ہیں ان میں سے چند کے اقتباسات ذیل میں دئے جاتے ہیں۔

ستائیسویں صدی قبل مسیح میں شمالی مصر کا ایک امیر اپنے مقبرے کے ایک کتبے میں اپنے نیک اعمال گنوانے کے بعد یوں گویا ہوتا ہے: "میں جھوٹ نہیں کہتا کیونکہ میرا باپ مجھ سے محبت کرتا تھا، میری ماں میری تعریف کرتی تھی، اپنے بھائیوں اور بہنوں سے میرا سلوک بہت اچھا تھا۔" جنوبی مصر کا ایک امیر لکھتا ہے: "بادشاہ میری تعریف کرتا تھا۔ میرے باپ نے (جائداد کی) وصیت میرے حق میں کی (کیونکہ) میرا چال چلن پسندیدہ تھا، میرا باپ مجھ سے محبت کرتا تھا اور میری ماں میری تعریف میں رطب اللسان تھی۔" ایک دوسرا شخص اسیطرح کے کتبے میں لکھتا ہے: "میں نے فیصلہ کیا کہ میں خود ایسے مقبرے میں دفن کیا جاؤں جہاں میرا باپ دفن ہے اس لئے کہ میں اس کے ساتھ ایک جگہ رہوں، اس لئے نہیں کہ مجھ میں ایک علیحدہ مقبرہ بنوانے کی استطاعت نہ تھی۔ یہ قدم میں نے اس لئے اٹھایا تاکہ میں اپنے باپ کو ہر روز دیکھ سکوں، تاکہ میں اور وہ ایک ہی جگہ رہیں۔" یہ اور اس طرح کے بے شمار کتبات سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس زمانے میں لوگوں میں عائلی زندگی کس طرح انسانی اخلاق اور بہترین

کردار کا مرکز بنی ہوئی تھی۔ لیکن اس کے ساتھ ہی ساتھ یہ چیز بھی قابلِ غور ہے کہ اخلاقی اقدار کا یہ دائرہ صرف اس حلقہ درون خانہ تک محدود ہو کر نہیں رہ گیا تھا بلکہ اس کا اثر و نفوذ وسیع سے وسیع تر ہوتا چلا گیا تھا۔ محبت و حسن سلوک کا جو بہترین نمونہ گھر کی چار دیواری کے اندر مختلف افراد سے تعلقات میں نظر آتا ہے وہ باہر دوسرے انسانوں کے ساتھ بھی ویسا ہی نمایاں ہے۔ مثلاً ستائیسویں صدی قبل مسیح کا ایک جاگیردار اپنی زندگی کے متعلق یوں کہتا ہے: "میں نے اپنے علاقہ کے بھوکوں کو اناج دیا، ننگوں کو کپڑے دئے، میں نے مویشیوں کی تعداد میں اضافہ کیا۔ میں نے پہاڑوں پر رہنے والے درندہ جانوروں اور ہوا میں اڑنے والے شکاری پرندوں کے لئے چھوٹے مویشیوں کا گوشت مہیا کیا...... میں نے کسی صاحبِ جائداد کو کبھی پریشان نہیں کیا الحمد للہ اس پر ظلم و ستم روا رکھا جس سے مجبور ہو کر وہ خدا سے میرے خلاف شکایت کرے۔ میں نے ساری عمر حق اور راستی کی بات کی۔ میرے حلقہ اثر میں کوئی شخص ایسا نہ تھا جس کو اپنے سے طاقتور سے خوف کھانے کا فکر ہو، جس کی بنا پر اسے خدا کی طرف رجوع کرنے کا موقع ہو۔ میں اپنے علاقے کے انسانوں، حیوانوں اور جانوروں کے لئے موجب راحت، اطمینان اور سکون بنا رہا..... میں جھوٹ نہیں کہتا کیونکہ میرا باپ مجھ سے محبت کرتا تھا، میری ماں میری بہت تعریف کیا کرتی تھی، میرا سلوک اپنے بھائیوں اور بہنوں سے بہت اچھا تھا۔"

اخلاقی زندگی کے لئے جہاں عائلی ماحول اور معاشرتی زندگی کی ضرورت ہے وہاں خدا کی صفاتِ حسنہ، اس زندگی اور کائنات میں اخلاقی اصولوں کی کارفرمائی اور سب سے بڑھ کر یہ کہ مرنے کے بعد خدا کے سامنے حاضر ہو کر اپنے اعمال کے حسن و قبح کی مکمل ذمہ داری کا احساس بھی ویسے ہی ناگزیر ہے۔ جب تک حیات بعد الموت کے تصور میں جواب دہی اور سزا و جزا کے تصورات شامل نہ ہونگے اخلاقی بلندی کا پیدا ہونا مشکل ہے۔ مصر میں ہر دور میں موت کے بعد دوبارہ زندہ ہونے کا تصور ہمیشہ سے موجود رہا ہے اور بڑے شد و مد سے رہا ہے اور لطف یہ ہے کہ ذمہ داری اور جوابدہی کا احساس محض چھوٹے طبقہ کے انسانوں کے سامنے نہیں بلکہ خود فرمانروائے مطلق فرعون کو بھی یہی خوف دامن گیر تھا کہ وہ اس آسمانی فیصلے کے وقت سرخرو ہو سکے۔ عام طور پر انسانی تاریخ میں یہ بات دیکھی گئی ہے کہ اس قسم کے تصورات نچلے طبقہ کے انسانوں کے سامنے تو رہتے ہیں لیکن امراء اور رؤسا اور بادشاہوں کو اس سے بری الذمہ سمجھا جاتا رہا ہے۔ لیکن مصریوں کی اخلاقی تاریخ میں یہ چیز واضح طور پر سامنے آجاتی ہے کہ تمام لوگ بلا استثنا حتیٰ کہ خود شہنشاہِ اعظم یعنی فرعون بھی اس یوم الحساب سے بچ نہیں سکتا اگر اس کے اعمال اخلاقی طور پر صحیح نہیں۔ چنانچہ کئی ایک مقابر کے کتبات میں اخلاقی اعمال کے حق میں خدا کا مالک یوم الدین ہونا بطور دلیل پیش کیا گیا ہے۔ چھبیسویں صدی قبل مسیح کے ایک عظیم الشان سیاح کا ایک مقبرہ موجودہ آسوان کی ایک پہاڑی پر واقع ہے۔ اس کے کتبات میں مختلف واقعات کی تفصیلات کے بعد مذکور ہے: "میرا باپ مجھ سے

محبت کرتا تھا، میری ماں میری بہت تعریف کرتی تھی، جس کے تمام بھائی اس کی محبت میں گرفتار تھے، میں بھوکوں کو روٹی کھلاتا اور ننگوں کو کپڑے پہناتا، اگر کسی مسکین اور محتاج کو دریا کے پار جانا ہوتو میں بلا مُزد اسے کشتی میں سوار کر کے پار لے جاتا۔ اے زندہ انسانو جو اس قبر کے پاس سے گزرو، اگر تم کہو کہ اس قبر کے مکین کے نام پر ایک ہزار روٹیاں اور ایک ہزار شربت کے گلاس مسکینوں میں تقسیم کروں گا تو میں (یعنی موت کی بعد کی) دنیا میں تمہاری خاطر سفارش کروں گا۔ مذہبی ادارے کا پروہت اور مندر کا پجاری ہونے کی حیثیت میں ان اوراد اور منتروں سے واقف ہوں جو اس موقع پر استعمال کئے جاتے ہیں۔ اگر کوئی شخص میرے اس مقبرے کی زمین پر قابض ہونے کی کوشش کرے گا تو میں جنگلی پرندے کی طرح اس پر حملہ کروں گا اور خدائے عظیم و برتر کے سامنے انہیں اس بداعمالی کا حساب دینا ہوگا۔ میں اپنی اس زندگی میں اچھی باتیں کہتا رہا اور پسندیدہ افعال کرتا رہا۔ میں نے کبھی صاحبِ اقتدار لوگوں کے سامنے کسی کے خلاف نہ شکایت کی اور نہ چغلی کھائی۔ میری تمنا تھی کہ خدائے برتر کے سامنے سرخ رو ہوسکوں۔ میں نے کبھی دو بھائیوں کے درمیان اس طرح فیصلہ نہیں کیا کہ ایک بھائی اپنے پدری ورثہ سے محروم ہوجائے۔"

اس تمام بیان سے یہ چیز واضح ہو جاتی ہے کہ موت کے بعد زندگی اور وہاں اپنے اعمال کی جواب دہی اور ان کے مطابق سزا اور جزا کے تصورات کو اس طرح پیش کیا گیا ہے کہ اس سے لوگ بداعمالیوں اور بداخلاقی کے کاموں سے بچ جائیں اور نیک اعمال کی طرف ترغیب ہوسکے۔ اس شخص نے اپنی تمام زندگی اس طرح بسر کی کہ اسے موت کے بعد خدائے بزرگ و برتر کے سامنے حاضر ہو کر اپنے تمام افعال، اعمال اور اقوال کا جواب دینا ہوگا۔ یہ تصورات جو آج سے پانچ ہزار سال پہلے ہمیں مصری لوگوں کے ہاں ملتے ہیں ان لوگوں کے لئے ضرور موجب تعجب ہیں جو خدا کے اس قول پر ایمان نہیں رکھتے کہ انسانوں کی ہدایت کی ذمہ داری اس نے لے رکھی ہے اور اس مقصد کے لئے اس نے ہر قوم میں ہادی و رہنما بھیجے۔ لیکن جس شخص کا اس پر ایمان ہے اس کے لئے یہ تمام واقعات و کتبات موجب ایزاد ایمان ہوتے کہ کس طرح اس خدائے برتر نے مختلف زمانوں میں مختلف قوموں کی ہدایت و رہنمائی کی ہے۔

ان تمام اخلاقی محاسن اور اقدار کی ترویج کا اصلی باعث یہی تھا کہ مصری علماء کا عقیدہ تھا کہ یہ کائنات اخلاقی اصولوں پر قائم و دائم ہے اور اس کا خالق بہترین اخلاق کی نصب العینی ہستی ہے جس طرح زرتشتیوں کے ہاں اس اخلاقی اصول کا جامع نام اشا وہشتہ (قانون تقوے) تھا اسی طرح مصریوں کے ہاں اس کیلئے ایک جامع لفظ "مآت" ہے جس میں تقوے، نیکی، عدل، صداقت سب محاسن شامل ہیں جس طرح زرتشتیوں نے اشا کو ایک مشخص ہستی کے طور پر پیش کیا اسی طرح مصریوں کے ہاں یہ مآت ایک مشخص وجود قرار پایا اور اس کو

سورج دیوتا کی بیٹی کے طور پر پیش کیا گیا۔ یہی وہ روح خیر ہے جو تمام کائنات میں جاری و ساری ہے۔ آت کا یہ تصوّر سب سے پہلے اس یادداشت میں واضح طور پر ملتا ہے جس کو "ٹاہوٹپ کی ہدایات" کا نام دیا جاتا ہے اور جو ۲۸۸۰ قبل مسیح کے قریب معرضِ وجود میں آئی۔ ٹاہوٹپ ایک صوبے کا گورنر اور مصری بادشاہ کا وزیر اعظم رہا ہے۔ جب بڑھاپے کے باعث وہ سرکاری ذمہ داریوں سے علٰحدہ ہوا تو اس نے اچھی حکومت اور خاص کر تقوے کی زندگی کے متعلق چند ہدایات تحریر کروائیں تاکہ اس کا بیٹا جو اب اس کی جگہ وزیر اعظم مقرر ہوا تھا ان سے مستفید ہو سکے۔ جو کچھ وہ بیان کرتا ہے وہ ان لوگوں کی باتیں ہیں جنہوں نے ان کو اُن بزرگوں سے سنا جنہوں نے انکو بلا واسطہ دیوتاؤں سے حاصل کیا تھا۔ یعنی دوسرے الفاظ میں ٹاہوٹپ کی ہدایات بالآخر کسی نہ کسی طرح کاہنوں اور رسولوں سے ماخوذ ہیں۔

یہ ہدایات اکثر تو اسی قسم کی ہیں جو بعد میں شیخ سعدی نے گلستان میں پیش کی ہیں۔ ان میں بادشاہ اور اس کے درباریوں کے تعلق کا نقشہ مطلق العنان آمروں کے درباروں جیسا ہے کہ اگر بادشاہ دن کو رات کہہ دے تو درباریوں کا فرض ہے کہ وہ دن کو رات ثابت کر کے دکھا دیں۔ لیکن جہاں عائلی زندگی اور عام انسانی تعلقات کے متعلق ہدایات ہیں ان میں اخلاقی اقدار کو سامنے رکھا گیا ہے "جب بدقسمتی اور بُرے حالات میں تم گرفتار ہو جاؤ تو اس وقت تمہاری نیکیاں اور تمہارا بلند اخلاق تمہارے دوستوں سے کہیں زیادہ تمہارے کام آئے گا۔" گھر کی زندگی کے متعلق لکھا ہے کہ اگر تمہاری زندگی کامیاب ہے تو اپنی عائلی زندگی کا نظام قائم کرو اور بیوی سے مناسب محبت کرو۔ اس کو پیٹ بھر کر خوراک دو اور اس کے بدن کے لئے عمدہ لباس مہیا کرو۔ جب تک تم زندہ ہو کوشش کرو کہ اس کا دل تمہاری طرف سے خوش ہو۔ وہ اپنے خاوند کے لئے ایک نفع بخش کھیت ہے۔ بالکل یہی تصوّر قرآن مجید میں موجود ہے:

نساء کم حرث لکم۔ (۲-۲۲۳) تمہاری عورتیں تمہاری کھیتی ہیں۔

لالچ اور طمع کے خلاف بڑے زوردار الفاظ میں مخالفت کی ہے، اس کا کہنا ہے کہ خاندانی زندگی اور دوسرے انسانی رشتوں کی بہبودی اسی میں ہے کہ انسان اس بُری عادت سے محفوظ رہے۔ یہ دوستوں کو دشمن میں تبدیل کر دیتی ہے، باپ اور ماں کے مقدس رشتہ کو پامال کرتی ہے، خاوند کو بیوی سے جُدا کرتی ہے۔ یہ بدی اور شر کا مصدر و منبع ہے اور تمام بداخلاقیوں کا سرچشمہ۔ لالچی کی قبر بھی نہیں رہتی۔ خالص اخلاقی حیثیت سے مندرجہ ذیل بیان قابلِ غور ہے:

"اگر تم کسی انتظامی کام پر مامور ہو تو یاد رکھو کہ اپیل کرنے والے کی بات فراخ دلی سے سنو۔ جب تک وہ دل کی تمام بات نہ کہہ ڈالے اسے مت ٹوکو۔ وہ شخص جو کسی ظلم کا شکار ہے، اس کی خواہش یہی ہوتی ہے کہ وہ اپنے دل کی بھڑاس نکال لے اور تمہیں چاہئے کہ اس کی ہمت بڑھاؤ۔ کسی کی بات کو دلچسپی سے سننا اور مہربانی سے

پیش آنا بہترین اخلاق ہے.....

"اگر تمہارا منصب یہ ہے کہ عوام کے لئے قوانین نافذ کرو تو اس کے لئے مناسب یہی ہے کہ بہترین مثالیں تلاش کرو تاکہ تمہارے احکام امکانی طور پر اغلاط اور نقائص سے پاک ہوں۔ تقوے، عدل اور نیکی ایک عظیم الشان چیز ہے۔ یہی پائدار اور لافانی چیز ہے اور جب سے خدائے مطلق نے اسے رائج کیا ہے کوئی اسے فنا نہیں کر سکا کیونکہ اسکی خلاف ورزی کرنے والا قابلِ سزا و تعزیر ہے..... بدقسمتی اور بدحالی میں انسان دولت سے محروم ہو سکتا ہے لیکن تقوے اور نیکی کی قوت اور استطاعت ہمیشہ قائم رہتی ہے" چنانچہ نوجوانوں کو کسی کام کے سرانجام دیتے وقت اس بات کو مدنظر رکھنے کی تاکید کی گئی ہے کہ "صداقت و تقوے کو ہمیشہ سامنے رکھو اور کبھی سرمو اس سے انحراف نہ کرو اگرچہ تمہارا فیصلہ تمہارے دل (یعنی جذبات) کے لئے کتنا ہی ناخوشگوار کیوں نہ ہو" اس کے بعد وہ لکھتا ہے: "اگر تم نے ان تمام باتوں کی طرف توجہ کی جو میں نے تم سے بیان کی ہیں تو ہمارے افعال و اعمال بعینہٖ اسلاف کی طرح ہونگے۔ تقوے اور نیکی تو آپ اپنی جزا ہے۔ اس کی یاد لوگوں کے دلوں سے کبھی محو نہیں ہو سکتی" ٹاہوٹپ کی اخلاقی روح کا شاید بہترین مظہر وہاں ملتا ہے جب وہ لالچ اور طمع کے خلاف احتجاج کرتے ہوئے کہتا ہے:

"صحیح اور قائم ہے وہ شخص جس کا معیار تقوے اور نیکی ہے اور جو اسی کے راستے پر گامزن ہے"

اس کی ہدایات کے آخری الفاظ بھی قابلِ غور ہیں: "ایک قابل لڑکا وہ ہے جو اپنے والد کے حکم کی مکمل تابعداری کرے۔ وہ نیکی، تقوے، عدل کا پیروکار ہے اور اس کا قلب اور اس کی روح اسی راستے پر گامزن۔ اگر تم نے وہ کچھ حاصل کر لیا جو میں حاصل کر چکا ہوں، تو تمہاری ساری ضروریات پوری ہونگی، بادشاہ بھی تم سے مطمئن ہوگا اور تمہیں میری طویل عمر نصیب ہوگی۔ میں ایک سو دس برس کی عمر تک پہنچ چکا ہوں اور بادشاہ نے مجھ پر بے حد عنایات اور بخششیں کی ہیں کیونکہ میں مرتے تک نیکی اور تقوے پر عمل پیرا رہا"

تمام دنیا کی اخلاقی تاریخ میں لفظ "مآت" شاید پہلا تجریدی تصور ہے جو مصر میں آج سے تقریباً پانچ ہزار سال پہلے انسانی ذہن نے پیدا کیا اور اس کے ساتھ ہی یہ تصور بھی پیدا ہوا کہ یہ نظامِ کائنات ایک بلند اخلاقی اصول کے مطابق وجود میں آیا جس کی تخلیق اور جس کی باگ ڈور ایک خالقِ واحد اور حکیم کے ہاتھ میں ہے۔ ارتقائی نقطۂ نگاہ سے دیکھا جائے تو اس کی توجیہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ مصر میں اس وقت شاید پہلی بار ایک منظم مرکزی حکومت قائم ہوئی جس نے مقامی حاکموں کی مطلق العنانی ختم کر کے ایک عظیم الشان شخصیت کے ماتحت تمام ملک کے باشندوں کی وفاداریاں اس کے گرد مرکوز کر دیں۔ اس طرح انسانی تاریخ میں پہلی بار عالمگیر اقتدار کا ایک حلقہ قائم ہوا جس کی بنیاد پر نظریۂ توحید کی تعمیر ہوئی اور جس کو حضرت ابراہیم خلیل اللہ اور دیگر انبیائے بنی اسرائیل نے چمکایا اور منور کیا۔ اس وقت دنیا کے کسی خطہ میں نہ کوئی ایسی مرکزی سلطنت

موجود تھی اور نہ اس قسم کا بلند اخلاقی تصور لوگوں کے سامنے آسکا۔ صدیوں بعد جب ایرانی بادشاہ سائیرس نے مغربی ایشیا میں ایک طرح کی مرکزی اور منظم حکومت قائم کی تو زرتشتی مفکرین بھی اسی طرح بلند اخلاقی تصور پیش کر سکے۔ لیکن یہ بھی ممکن ہے کہ ایک بلند رتبہ شخص اپنی ذہنی فراست و فکری عظمت کے باعث اس پاکیزہ تصور تک پہنچ سکے حالانکہ اس کے ارد گرد کوئی اس قسم کی عظیم الشان مرکزی اور منظم سلطنت موجود نہ ہو۔ چنانچہ قرآن میں حضرت ابراہیمؑ کی اس ذہنی کش مکش کا نقشہ مکمل طور پر مندرج ہے جہاں سے معلوم ہوتا ہے کہ کس طرح وہ اپنے زمانے کے مشرکانہ تصورات، ستارہ پرستی اور شمس اور قمر دیوتاؤں کے عقائد سے بالا ہو کر خالص توحید تک جا پہنچے اور جنہوں نے اپنے اس بلند تصور کے لئے ایک بہترین دلیل بھی مہیا کی۔ تاریخی طور پر یہ چیز بالکل پایۂ ثبوت تک پہنچ چکی ہے کہ حضرت ابراہیم کے زمانے میں مغربی ایشیا میں اور خاص اس علاقے میں جہاں حضرت ابراہیم پیدا ہوئے اور جوان ہوئے کوئی ایک مرکزی سلطنت موجود نہ تھی۔ پھر ایسے حالات میں ان کا ایک بلند ترین اور معقول نظریۂ توحید پیش کرنا کیا اس چیز کی علامت نہیں کہ ایسے تصورات کی پیدائش محض ماحول کی پیداوار نہیں ہوتی بلکہ بعض افراد ایسے بھی ہیں جو ان تمام مکانی اور زمانی قیود سے بالا اور بے نیاز ہو کر حقیقت تک پہنچنے میں کامیاب ہو سکتے ہیں:

وکذالک نری ابراھیم ملکوت السماوات والارض ولیکون من الموقنین فلما جن علیہ اللیل راکوکبا ۰ قال ھذا ربی ج فلما افل قال لا احب الآفلین۔ فلما را القمر بازغا قال ھذا ربی ج فلما افل قال لئن لم یھدنی ربی لاکونن من القوم الضالین۔ فلما را الشمس بازغۃ قال ھذا ربی ھذا اکبر ج فلما افلت قال یاقوم انی بریٔ مما تشرکون ۰ انی وجھت وجھی للذی فطر السماوات والارض حنیفا وما انا من المشرکین۔ (۶-۷۶-۸۰)

ہم ابراہیم کو زمین اور آسمان کے عجائبات دکھانے لگے تاکہ وہ یقین حاصل کر سکے۔ جب رات نے ان کو ڈھانپ لیا تو ایک ستارہ نظر پڑا۔ کہنے لگا یہ میرا پروردگار ہے جب وہ غائب ہو گیا تو کہنے لگا کہ مجھے غروب ہونے والے پسند نہیں جب چاند کو چمکتے ہوئے دیکھا تو کہنے لگا کہ یہ میرا پروردگار ہے۔ لیکن جب وہ بھی غروب ہو گیا تو بول اٹھا کہ اگر میرا پروردگار مجھے سیدھا راستہ نہ دکھائیگا تو میں گمراہوں میں ہو جاؤں گا۔ پھر جب سورج کو جگمگاتے دیکھا تو کہنے لگا کہ یہ میرا پروردگار ہے۔ یہ سب سے بڑا ہے، مگر جب وہ بھی غروب ہو گیا تو کہنے لگا کہ لوگو جن چیزوں کو تم شریک بناتے ہو میں ان سے بیزار ہوں میں نے سب سے یکسو ہو کر اپنے تئیں اسی ذات کی طرف متوجہ کیا جس نے آسمانوں اور زمینوں کو پیدا کیا ہے اور میں مشرکوں میں سے نہیں ہوں۔

ان آیات میں قرآن نے تفصیل سے حضرت ابراہیم کی ذہنی کش مکش اور نفسیاتی کیفیات کے علاوہ دلائل بھی پیش کئے ہیں کہ کس طرح وہ ایک منزل سے دوسری منزل اور ایک تصوّر سے دوسرے تصوّر تک پہنچے اور وہ کون سی وجوہات تھیں جن کی بنا پر وہ ستاروں، چاند اور سورج کو اپنا پروردگار ماننے سے منکر ہوئے اور وہ کیا چیز تھی جس نے آخر کار انہیں توحید کی طرف مائل کیا۔ یہ حقیقت اپنی جگہ مسلّم ہے کہ خارجی حالات انسان کی داخلی زندگی پر اثر انداز ہوئے بغیر نہیں رہتے لیکن ان اثرات کی حیثیت محض انسانی ذہن وقلب کو ایک خاص منہاج پر لے جانے کی ہوتی ہے، اس کے تصورات وخیالات کی نوعیت اس کے اپنے ذہن کی داخلی پیداوار ہوتے ہیں۔ اگر ہر شخص محض اپنے حالات کی پیداوار ہو تو زندگی ارتقاء کی منزلیں طے نہ کر سکتی اور ارتقا اگر ہوتا بھی تو شاید کروڑوں سالوں کے بعد۔ پھر خود مصر کی تاریخ کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ جب ٹاہوٹپ کے دَور کے بعد ایک مرکزی اور منظّم سلطنت ختم ہوگئی تو یہ اخلاقی تصورات اور نظریۂ توحید غائب ہونے کی بجائے ترقی کرتے چلے گئے اور ان میں وسعت اور گہرائی پیدا ہوتی چلی گئی۔ چنانچہ اسی دَور کے ایک بادشاہ کے چند نصائح ہمارے پاس محفوظ ہیں۔ بدقسمتی سے ہم اس کے اپنے نام سے واقف نہیں لیکن اس نے یہ ہدایات اپنے بیٹے کو دی ہیں جس کا نام "میری کری" ہے ان ہدایات میں اصولِ اخلاق یعنی تقوٰے، عدل، نیکی اور صداقت پر پورا پورا زور دیا گیا ہے۔ بادشاہ کا خیال ہے کہ اگر امراء اور سرکاری ملازمین کو اپنے روزگار کی طرف سے اطمینان نہ ہو تو ان سے نیک اعمال اور صحیح انصاف کی توقع عبث ہوگی اس لئے اس نے اپنے بیٹے کو نصیحت کی ہے کہ جہاں قابلیت اور جوہر شناسی کا تقاضا یہ ہے کہ امیر اور غریب کی تمیز قائم نہ رکھی جائے وہاں یہ بھی ضروری ہے کہ امرا کو ان کے مرتبہ کے مطابق نوازش کی جائے تاکہ وہ انصاف اور عدل کے مقتضیات کو ہر لمحہ پورا کر سکیں۔ اسی طرح اس نے اخلاقی اعمال میں حُسنِ نیت کی اہمیت کو اُجاگر کرنے کی کوشش کی "ایک نیک آدمی کی نیکی اور راس کا تقوٰے زیادہ قابلِ پذیرائی ہے بہ نسبت اس شخص کی گائے کے جس کے ہاتھ اور جس کا قلب بدیوں اور فسق وفجور میں مبتلا ہیں۔ اس کے باوجود خدا کے سامنے اپنی قربانی پیش کر.... کیونکہ خدا قربانی پیش کرنے والے کی نیت وعلم کو لے لیتا ہے۔"[۱]

اسی طرح وہ اپنے بیٹے کو کہتا ہے کہ جب تم تخت پر بیٹھو تو نیکی کرو تاکہ تمہاری حکومت مستحکم ہو۔ غم زدہ انسانوں سے ہمدردی کرو۔ بیوی پر ظلم مت کرو۔ کسی آدمی کو اس کے جائز آبائی ورثے سے محروم نہ کرو......

---

[۱] قربانی کے سلسلے میں قرآن کی مندرجہ ذیل کس طرح اس تصوّر کی تصدیق کرتی ہے:

لن ینال اللہ لحومہا ولا دماؤھا ولکن ینالہ التقوٰی منکم۔ (۲۲: ۳۰)

خدا تک نہ ان کا گوشت پہنچتا ہے اور نہ خون بلکہ اس تک تمہارا تقوٰے اور حُسنِ نیت پہنچتی ہے۔

خدا ظالم و فاسق کے ظلم و فسق سے خبردار ہے اور اس کا بدلہ خود اسے دے گا۔"

موت کے بعد کی زندگی کا تصور جیسا کہ اوپر ذکر ہو چکا ہے مصریوں کے ہاں ایک پختہ یقین و ایمان کی حد تک تھی لیکن ان کے ہاں آئندہ زندگی میں راحت کا تصور اخلاقی بلندی کے ساتھ وابستہ نہیں تھا۔ لیکن آہستہ آہستہ اس تصور میں پاکیزگی اور بلندی پیدا ہوتی گئی اور جزا اور سزا کے تصورات اخلاقی کردار کی بلندی اور کمزوری کے ساتھ وابستہ کئے جانے لگے۔ چنانچہ مذکور ہے کہ تم جانتے ہو کہ جج انصاف کرنے کے دن کسی فاسق و فاجر انسان پر رحم نہیں کھاتے .... اس بات سے مدہوش نہ ہو جاؤ کہ زندگی کے دن بہت طویل ہیں کیونکہ اس دنیا کے حاکم کے لئے ایک پوری زندگی محض ایک ساعت سے زیادہ نہیں۔ آدمی موت کے بعد زندہ رہتا ہے اور اس کے اعمال اس کے سامنے پہاڑ کی طرح ڈھیر کر دئے جاتے ہیں۔ وہ زندگی ابد کی زندگی ہے جو کبھی ختم نہ ہوگی۔ نادان ہے وہ جو اس سے غافل ہے۔ وہ شخص جو وہاں پہنچتا ہے اس حالت میں کہ وہ گناہوں سے پاک ہے، تو وہ وہاں اس طرح رہیگا جیسا کہ دیوتا، اور وہ وہاں چلیگا پھرے گا گویا وہ ابد کا سردار ہے۔" "روح اس جگہ جائے گی جس سے وہ واقف ہے اور جس راستے پر وہ یہاں گامزن رہی ہے اسی پر وہ اپنا وظیفۂ حیات پورا کرتے چلی جائے گی۔"

مندرجہ ذیل بیان زیادہ قابلِ غور ہے:

"انسانوں کی ایک نسل کے بعد دوسری نسل آتی رہتی ہے اور خدا جو لوگوں کے دلوں کے حال سے واقف اور ان کی سیرت سے خبردار ہے اس نے اپنے آپ کو لوگوں کی آنکھوں سے چھپا رکھا ہے۔ وہ اُن تمام چیزوں سے بالا ہے جن کو تم اپنی آنکھوں کے سامنے (مختلف مورتیوں کی صورتوں میں) دیکھتے ہو۔" کہیں کہیں کثرت پرستی کی طرف اشارات کے باوجود خدا کی وحدانیت کا پورا پورا تصور سامنے آجاتا ہے۔ ان ہدایات کے آخر میں مندرجہ ذیل فقرات قابلِ غور ہیں:

"انسان خدا کا گلہ اور رعیت ہے۔ اس نے اس زمین اور آسمان کو ان کے لئے بنایا، اس نے پیاس بجھانے کے لئے پانی مہیا کیا، اس نے ہوا پیدا کی تاکہ وہ سانس لے سکے۔ وہ اس کی شکل پر ہیں جو اس کے اعضاء سے پیدا ہوئے۔ اس نے پودے اور جانور، مچھلی اور پرندے بنائے تاکہ وہ ان سے اپنی خوراک حاصل کر سکیں۔ جب وہ روتے اور گڑگڑاتے ہیں تو وہ سنتا ہے وغیرہ۔"

اخلاقی زندگی کے ارتقاء کے لئے معاشرتی زندگی کا نظام اور اس میں مروجہ اعمال و اقوال کی پابندی کی اہمیت بالکل واضح ہے لیکن بعض دفعہ ایک خاص دور میں کچھ آدمی اس طرح کے بھی پیدا ہو جاتے ہیں جنکی نگاہ میں یہ پابندیاں محض بوجھ ہو کر رہ جاتی ہیں۔ انہیں محسوس ہونے لگتا ہے کہ ان رسوم کی پابندی اخلاقی زندگی کو جاندار بنانے کی بجائے مردگی اور سکون و جمود کی طرف لے جاتی ہے۔ اس وقت ان کے نفس کے اندر

ایک خوفناک اور تلخ کش مکش پیدا ہونی شروع ہوتی ہے۔ یہ کش مکش ایک طرح کی چھوٹے پیمانے پر خیر و شر کی خارجی آویزش کے مماثل ہوتی ہے اور جو انسان اس کا شکار ہوتا ہے اس کے لئے اس سے نبٹنا اور عہدہ برآ ہونا کافی دشوار ہوتا ہے۔ لیکن تاریخی طور پر یہ بھی حقیقت ہے کہ انسانی اخلاق کی تمام بلندیاں اور عالمگیر حقیقتوں کی تمام نورانیاں ایسے ہی لوگوں کی داخلی اور نفسیاتی کش مکش پر قابو پا لینے سے پیدا ہوتی ہیں۔ زرتشت اور مسیح کی زندگیوں میں "آزمائش" کا وجود اس بات کی طرف راہنمائی کرتا ہے کہ یہ جلیل القدر انسان کس طرح کی شدید نفسیاتی کش مکش میں مبتلا رہے۔ اسی طرح بھگوت گیتا میں ارجن کی زندگی کا جو نقشہ پیش کیا گیا ہے وہ اسی خیر و شر کی دائمی آویزش کی ایک دلچسپ کہانی ہے۔ حضرت ایوب کے جو کچھ واقعات عہدِ عتیق کی کتاب "ایوب" میں بیان کئے گئے ہیں وہ بھی اسی سلسلے کی کڑی ہیں۔ ایسے ہی لوگ اور ان کے اس قسم کے تجربات ہی ہیں جن کے باعث آہستہ آہستہ انسان کی اخلاقی زندگی میں وسعت اور گہرائی پیدا ہوتی چلی گئی کیونکہ اخلاق کا تعلق جس قدر خارجی ماحول اور معاشرے کی صحیح تنظیم سے ہے اس سے کہیں زیادہ ایسے بلند پایہ اور حکیم مفکرین کی داخلی زندگی کے تجربات سے بھی ہے۔ اسی پایہ کی چیز مصر کی تاریخ میں بھی ملتی ہے۔ مسٹر بریسٹڈ نے اس تحریر کا عنوان بہت عمدہ تجویز کیا ہے۔ یعنی "ایک مردم بیزار انسان کا اپنی روح سے مکالمہ"۔ نامعلوم شخص کو زندگی کے ایک خاص دور میں آکر مختلف مصیبتوں کا سامنا کرنا پڑا اور جیسا کہ اس تحریر کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے وہ ان کا مستحق نہیں تھا اور اسی شدت احساس کے باعث اس نے خودکشی کرنے کا فیصلہ کیا۔ عین اس وقت اس میں اور اس کی روح میں بحث چھڑتی ہے۔ روح کہتی ہے کہ موت اور خاص کر ایسی حالت میں موت جبکہ حالات بالکل ناموافق ہوں، عزیز اور دوست ماتم کرنے کے لئے موجود نہ ہوں اور اس بات کا بھی امکان ہو کہ اس کے لئے قبر کا انتظام نہ ہو سکے گا، یقیناً ایک مصیبت عظمیٰ ہے۔ لیکن پھر وہی روح تمام انسانی کوششوں کا مذاق اڑاتی ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ انسان اپنے لئے موت کے بعد پتھروں اور اینٹوں کی پختہ عمارتیں کھڑی کرتا ہے اس امید میں کہ شاید ابدالآباد تک اس دنیا میں اس کی یاد رہ سکے۔ لیکن یہ محض خام خیالی ہے۔ ایک بادشاہ اور ایک لاوارث کی موت یکساں ہے تو پھر موت کی تمنا کیوں کی جائے! بہتر ہے کہ جو وقتِ عزیز اس وقت میسر ہے اس سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے عیش و عشرت اور آرام و لذت سے زندگی گزاری جائے۔

لیکن اس کے بعد اس مکالمہ میں یکے بعد دیگرے چار نظمیں شامل ہیں جن میں اس کی نفسیاتی کش مکش اور تغیراتِ احوال کا تفصیلی نقشہ پیش کیا گیا ہے۔ ان کا خلاصہ یہ ہے کہ یہ زندگی عشرت امروز میں اُلجھ کر رہ جانے کے لئے کوئی موقع فراہم نہیں کرتی؛ اور اگر کرتی بھی ہے تو اس میں سکون و راحت کی بجائے تلخیاں بہت زیادہ ہیں۔ دنیا کا یہ ماحول زندگی کے لئے کسی طرح بھی سازگار نہیں۔ پہلی نظم میں وہ اس چیز سے شدید طور پر نالاں ہے کہ اس کی عزت خاک میں مل چکی ہے اور وہ اپنے ہم عصروں میں اتنا بدنام ہو چکا ہے کہ لوگ اس کی شکل دیکھنے سے بیزار

ہیں۔ دوسری نظم میں وہ اپنے اردگرد نظر ڈالتا ہے تو اسے کوئی ہمدرد اور مونس نہیں ملتا۔ عزیز اور دوست سب بے وفا ہیں، ہر طرف دھوکا اور بددیانتی عام ہے۔ نیک آدمی کے لئے زندگی دوبھر ہے اور بدکردار ظاہری طور پر آرام و سکون سے مزے اُڑا رہے ہیں اور کوئی ان کو گرفت نہیں کر سکتا۔ معاشرتی زندگی عیوب اور فسق و فجور سے بھری پڑی ہے۔ کوئی نیک آدمی نہیں جس کے پاس فریاد کی جا سکے۔ اس سوچ بچار کا لازمی اور منطقی نتیجہ یہی ہے کہ موت بہرحال بہتر ہے چنانچہ تیسری اور چوتھی نظموں میں موت کو خوش آمدید کہا گیا ہے کیونکہ اس سے ایک طرف تو مصائب سے نجات مل سکے گی۔ اور دوسری طرف یہ اطمینان نظر آتا ہے کہ اس طرح خدا کے انصاف کا مظاہرہ ہوگا۔

---


## سرسیّد کے مذہبی افکار (انگریزی)

(مصنّفہ بشیر احمد ڈار)

سرسید احمد خاں ایک ترقی پسند اور روشن خیال تحریک کے علمبردار تھے۔ اور اُنیسویں صدی میں ہندوستان کے معاشرتی اور سیاسی حالات کو ملحوظ رکھتے ہوئے اُنہوں نے اسلامی تعلیمات کی جو تشریح و توضیح کی اس کو اس کتاب میں بڑی خوبی سے بیان کیا گیا ہے۔ قیمت دس روپے۔

## افکار ابنِ خلدون

(مصنّفہ محمد حنیف ندوی)

عمرانیات اور فلسفۂ تاریخ کے امام اوّل ابنِ خلدون کے تنقیدی، عمرانی اور دینی و علمی خیالات و افکار کا ایک تجزیہ۔

صفحات ۲۳۲۔ قیمت ۴/۴ روپے

— ملنے کا پتہ —

ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ۔ کلب روڈ۔ لاہور